الرسالة الثالثة في الغيبة

تأليف

الامام الشيخ المفيد محمد بن محمد بن النعمان ابن المعلم ابي عبد الله، العكبري، البغدادي (336-413ه)

تحقيق

علاء آل جعفر

غیبت کے بارے میں تیسرا رسالہ

تالیف: امام شیخ مفید محمد بن محمد بن نعمان ابن المعلم ابو عبد اللہ، العکبری، البغدادی (336-413 ہجری)

تحقیق: علاء آل جعفر

ائمہ علیہم السلام اور صاحب الزمان علیہ السلام کے ظہور اور غیبت میں فرق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یہ رسالہ درجہ کے اعتبار سے دو سابقہ رسالوں کے بعد آتا ہے۔ کیونکہ جب امام کے وجود کا لازم ہونا ثابت ہو گیا، اور دلیل سے صاحب الزمان علیہ السلام کے وجود اور ان کی غیبت کا ثبوت حاصل ہو گیا،

تو اس رسالے میں سائل نے یہ سوال پیش کیا کہ امام علیہ السلام اور ان کے آباء و اجداد علیہم السلام میں کیا فرق ہے؟ کیونکہ وہ سب ظاہراً موجود تھے، جبکہ یہ امام علیہ السلام غائب ہیں۔ گویا سائل نے یہ بات سنی تھی کہ غیبت کی علت "ظالموں کے خوف سے" ہے، تو اس پر اعتراض کیا۔

چنانچہ بعض سائلین نے یہی اعتراض شیخ کی خدمت میں پیش کیا اور کہا:

"میں نے آپ سے درخواست کی ہے کہ اللہ آپ کو جواب دینے میں توفیق دیتا رہے، اس سوال کا جواب مرحمت فرمائیں۔"

سوال کا خلاصہ یہ ہے:

اگر غیبت کی علت — جس کی مدت طویل ہو گئی اور جس کے ایام دراز ہو گئے — دشمنوں کی کثرت اور ان کے خوف سے اپنی جان کی حفاظت تھی، تو ابتدائی زمانوں میں امام علیہ السلام کے آباء پر حالات اس سے زیادہ سخت تھے، ان کے دشمن زیادہ تھے، اور ان کے لیے خطرہ بھی زیادہ اور شدید تھا۔ اس کے باوجود وہ ظاہراً موجود رہے، نہ چھپے، نہ اپنے شیعوں سے غائب ہوئے، یہاں تک کہ ان پر "یقین" (یعنی موت) آ گیا۔ پس اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیبت کی یہ علت باطل ہے۔

شیخ نے اس اعتراض کا جواب دو مختلف حالتوں کے فرق سے دیا —یعنی صاحب الزمان علیہ السلام کی حالت اور ان کے آباء ائمہ علیہم السلام کی حالت کے فرق سے۔

ائمہ سابقین علیہم السلام کے احوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے لیے دشمنوں سے تقیہ جائز قرار دیا گیا تھا۔

انہوں نے ظاہری طور پر تلوار کے ساتھ قیام نہیں کیا، کیونکہ اس میں مصلحت نہیں تھی، اور ان پر تلوار کے ساتھ دعوت دینے کی ذمہ داری بھی نہیں تھی۔

بلکہ مصلحت اسی میں تھی کہ وہ دشمنوں کی مجلسوں میں حاضر رہیں، ان سے میل جول رکھیں۔

اسی وجہ سے انہوں نے تلوار اٹھانے اور اس کی دعوت دینے کو حرام قرار دیا، تاکہ دشمنوں کو ان کے ظہور اور لوگوں میں ان کی موجودگی کے بارے میں بدگمانی نہ ہو۔

انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ فرمایا کہ ایک منتظر امام آخر الزمان میں آئے گا، جو انہی میں سے ایک امام ہوگا، جس کے ذریعے اللہ غم واندوہ کو دور کرے گا، سنت کو زندہ کرے گا، امت کو ہدایت دے گا، اور جس کے ظہور کے وقت تقیہ کی گنجائش نہیں ہوگی۔

شیخ نے اسی موقع پر ظہور کی کئی علامات کا بھی ذکر کیا۔

چونکہ صاحب الزمان علیہ السلام کے آباء واجداد علیہم السلام سے یہ بات ظاہر تھی اور ہر زمانے کے سلطان و بادشاہ پر بھی واضح تھی، اس لیے وہ جان گئے کہ ائمہ سابقین علیہم السلام تلوار کے ساتھ قیام کا عقیدہ نہیں رکھتے، نہ اپنی طرف دعوت دینے کے قائل ہیں، بلکہ وہ تقیہ، خاموشی، زبان کی حفاظت، عبادت میں مشغول رہنے، اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے اللہ سے تعلق قائم رکھنے کے پابند ہیں۔

جب ظالموں کو ائمہ کی یہی حالت معلوم ہوگئی، تو انہوں نے ائمہ علیہم السلام سے اپنے لیے اطمینان حاصل کیا، ان سے اپنے معاملات میں امن محسوس کیا، اور ان کی یہی طرزِ عمل ظہور اور غیبت کی ضرورت سے بے نیازی کا سبب بن گئی۔

لیکن امامِ زمانہ علیہ السلام کے بارے میں معاملہ مختلف ہے۔

کیونکہ وہی وہ امام ہیں جن کے بارے میں تلوار کھینچنے، دشمنوں سے جہاد کرنے، اور جن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہی مہدی ہیں جن کے ذریعے اللہ حق کو ظاہر کرے گا اور ان کی تلوار سے باطل کو مٹا دے گا۔

لہٰذا دشمن ان کی تاک میں رہتے ہیں، ان کے قتل کے درپے ہیں، اور ان کا خون بہانے کے خواہشمند ہیں۔

چونکہ ابھی ان کے انصار (مددگار) ظہور کے وقت کے لیے تیار نہیں ہیں، لہٰذا ان پر تقیہ لازم ہوا، اور غیبت ان پر فرض ہو گئی۔

کیونکہ اگر وہ بغیر مددگاروں کے ظاہر ہوتے، تو وہ اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتے، اور اگر اپنے وقت سے پہلے ظاہر ہوتے، تو دشمن ان کے استیصال اور ان کے تمام شیعوں کے قتل و خونریزی میں کوئی کسر نہ چھوڑتے۔

اور چونکہ ان کی عصمت قطعی دلائل سے ثابت ہے، اس لیے ان کے لیے ضروری ہوا کہ وہ اپنے دشمنوں سے چھپے رہیں، یہاں تک کہ انہیں یقینی طور پر علم ہو جائے کہ ان کے مددگار موجود اور جمع ہو چکے ہیں، اور ان کے ظہور کے لیے عمومی مصلحت ظاہر ہو چکی ہے۔

اسی طرح ان کی حالت ان کے آباء ائمہ علیہم السلام کی حالت سے مختلف ہو گئی۔

پھر شیخ نے مخالفین کے سامنے نبی اکرم ﷺ کے حالات اور ان کی پاکیزہ سیرت بیان کرتے ہوئے استدلال کیا کہ آپ ﷺ نے مکہ مکرمہ میں تیرہ سال قیام فرمایا، اس دوران نہ تلوار کھینچی اور نہ ہی جہاد کیا، بلکہ تکذیب، طرح طرح کی اذیتوں اور اپنے اصحاب پر ہونے والے مختلف قسم کے ظلم و ستم پر صبر فرمایا۔ مسلمان آپ ﷺ سے تلوار اٹھانے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کی اجازت طلب کرتے، مگر آپ ﷺ انہیں منع فرماتے اور صبر کا حکم دیتے۔ آپ ﷺ کا یہی طریقہ رہا یہاں تک کہ آپ ﷺ نے نجاشی بادشاہ حبشہ سے درخواست کی کہ وہ قریش سے آپ کے اصحاب کو پناہ دے، پھر آپ ﷺ نے اپنے اصحاب کو اس کی طرف بھیجا، اور خود اپنے خون کے خوف سے تین سال تک شعبِ ابی طالب میں چھپے رہے۔ پھر جب آپ ﷺ کے چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا تو آپ ﷺ مکہ سے خفیہ طور پر نکل گئے اور تین دن غار میں قیام فرمایا، پھر مدینہ منورہ کی طرف ہجرت فرمائی۔ وہاں جا کر آپ ﷺ نے تلوار اٹھانے کا ارادہ فرمایا اور اپنے اصحاب کو جہاد کے لیے ابھارا، اس وقت آپ

ﷺ کے اصحاب کی تعداد تین سو سے کچھ زیادہ تھی، اور آپ ﷺ نے ان کے ساتھ بدر کے مقام پر اہلِ بدر میں سے ایک ہزار کے لشکر سے مقابلہ فرمایا، اور اس موقع پر آپ ﷺ نے اپنے اوپر تقیہ ختم فرمادیا۔

شیخ نے سیرتِ نبوی کی بہت سی تفصیلات ذکر کیں، پھر فرمایا:

تو آپ ﷺ نے مکہ میں کیوں قتال نہیں کیا؟ اور اذیت پر صبر کیوں فرمایا؟ اور اپنے اصحاب کو جہاد سے کیوں روکا، جب کہ وہ اسلام کی نصرت کے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کو تیار تھے؟ اور کس چیز نے آپ ﷺ کو نجاشی کی پناہ لینے پر مجبور کیا؟ اور کس بات نے آپ ﷺ کو اپنے اصحاب کے ساتھ، باوجود قلیل تعداد اور بعض کے کمزور ہونے کے، جنگ پر آمادہ کیا؟ اور ان مختلف مواقع پر آپ ﷺ کے حالات اور اعمال میں اختلاف کی وجہ کیا تھی؟

تو جو جواب تم ان سوالات کا دو گے، وہی ہمارا جواب ہے اماموں علیہم السلام اور صاحبِ زمانہ علیہ السلام کے درمیان ظہور اور غیبت کے فرق میں۔

اور ہمارے نزدیک وجہ بالکل واضح ہے، وہ یہ کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی پیروی کرنا واجب ہے، جیسا کہ اس نے ان پر عمل اور سیرت کے اعتبار سے مقرر فرمایا ہے، اور یہ سب احکام عام مخلوق کے مصالح کے مطابق ہیں، اور معصومین علیہم السلام اس کے بندے ہیں، جو اس سے پہلے کوئی بات نہیں کرتے، (وَهُمْ بِأَمْرِهِ يَعْمَلُونَ) (اور وہ اسی کے حکم سے عمل کرتے ہیں)۔

اور اسی طرح کی معارضت سابقین کے کلمات میں بھی منقول ہے، چنانچہ اسے شیخ صدوق کی کتاب اکمال الدین میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

واللہ ہی توفیق دینے والا ہے۔

تحریر

السید محمد رضا الحسینی الجلالی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شیخ مفید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

میں ایک بڑے رئیس کی مجلس میں حاضر تھا۔ باتوں کا سلسلہ امامت کے ذکر تک پہنچا، اور وہاں سے غیبت کے مسئلے پر گفتگو ہونے لگی۔

مجلس کے صاحب نے کہا:

کیا شیعہ امام جعفر بن محمد علیہ السلام سے یہ روایت نہیں کرتے کہ اگر امام کے لیے بدر والوں کی تعداد کے برابر، یعنی تین سو اور کچھ افراد جمع ہو جائیں تو اس پر تلوار کے ساتھ خروج واجب ہو جاتا ہے؟

میں نے کہا:

یہ حدیث روایت ہوئی ہے۔

انہوں نے کہا:

کیا ہم یقینی طور پر نہیں جانتے کہ اس وقت شیعوں کی تعداد بدر والوں سے کہیں زیادہ ہے؟ تو پھر اس روایت کے ہوتے ہوئے امام کے لیے غیبت جائز کیسے ہو سکتی ہے؟

میں نے کہا:

اگرچہ اس زمانے میں شیعوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، یہاں تک کہ وہ بدر والوں سے کئی گنا بڑھ گئے ہیں، لیکن وہ جماعت جن کی (تعداد بدر والوں کے برابر ہو اور جب وہ جمع ہوں تو امام پر تقیہ جائز نہ رہے اور اس پر ظہور واجب ہو جائے) ابھی تک جمع نہیں ہوئی، نہ ہی وہ اس وقت اپنے اوصاف و شرائط کے ساتھ موجود ہیں۔ اس لیے کہ ان لوگوں میں شجاعت، مقابلے میں صبر، جہاد میں اخلاص، دنیا پر آخرت کو ترجیح دینا، باطن کا عیبوں سے پاک ہونا، عقل کی درستگی، مقابلے کے وقت کمزوری یا پسپائی نہ کرنا، اور خدا تعالیٰ کی طرف سے یہ علم ہونا ضروری ہے کہ ان کے تلوار کے ساتھ ظہور میں عمومی مصلحت ہے۔ اور تمام شیعہ ان اوصاف کے حامل نہیں ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ جانتا کہ ان میں اس شرط کے مطابق اتنی تعداد موجود ہے، تو امام علیہ السلام یقیناً ظاہر

ہو جاتے، اور ان کے جمع ہونے کے بعد پلک جھپکنے جتنا بھی غائب نہ رہتے۔ لیکن حال اس کے برعکس ہے، اسی لیے امام کے لیے غیبت جائز ہوئی جیسا کہ ہم نے بیان کیا۔

انہوں نے کہا:

ہمیں کہاں سے یقین ہو کہ ان لوگوں کی شرائط وہی ہیں جو تم نے بیان کی ہیں؟ اور اگر ان کی شرائط یہ ہیں تو ہمیں کہاں سے علم ہو کہ معاملہ ویسا ہی ہے جیسا تم نے کہا؟

میں نے کہا:

جب امامت کا وجوب ثابت ہو گیا اور غیبت کی صحت واضح ہو گئی تو ہمارے لیے اس روایت کی توجیہ اسی طرح ممکن ہے جیسے ہم نے بیان کی۔ کیونکہ جب امامت، عصمت اور خبر کی سچائی کے دلائل قائم ہو جائیں تو ہم اسی کے مطابق حکم لگاتے ہیں۔

پھر میں نے کہا:

اس معاملے کی ایک مثال ہمیں نبی کریم ﷺ کے جہاد میں ملتی ہے کہ آپ ﷺ نے بدر کے موقع پر تھوڑی سی تعداد کے ساتھ جنگ کی، اور ان میں سے اکثر کے پاس ہتھیار بھی نہ تھے، مگر پھر آپ ﷺ نے حدیبیہ کے سال صلح اختیار کی جبکہ اس وقت آپ ﷺ کے اصحاب کی تعداد بدر کے لوگوں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ اور ہم جانتے ہیں کہ نبی ﷺ دونوں موقعوں پر صائب اور درست تھے۔ اگر حدیبیہ کے اصحاب میں وہی صفات ہوتیں جو بدر والوں میں تھیں تو نبی ﷺ کے لیے بیٹھے رہنا اور صلح کرنا ممکن نہ ہوتا، بلکہ جہاد واجب ہوتا جیسا کہ بدر میں ہوا تھا۔ اور اگر وہ واجب ہوتا تو آپ ﷺ ہرگز اسے ترک نہ کرتے، کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ آپ ﷺ کا ہر فعل درست اور معصومانہ ہوتا ہے جیسا کہ ہم نے واضح کیا۔

انہوں نے کہا:

رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوتی تھی، اس لیے وہ وحی کے ذریعے انجام کو جانتے تھے اور تدبیر کے درست و غلط پہلوؤں کو پہچانتے تھے۔ تو امام کے بارے میں تم جو کہتے ہو، وہ ان امور کو کس طرح جانتا ہے؟

میں نے کہا:

امام ہمارے نزدیک عہد یافتہ ہوتا ہے، اسے پیش آنے والے امور سے آگاہ کیا جاتا ہے، اور اسے ایسی نشانیاں دی جاتی ہیں جن سے وہ تدبیر کے انجام اور اعمال کی مصلحت کو پہچانتا ہے۔ اسے یہ علم نبی ﷺ سے ملا ہے، جن پر وحی نازل ہوتی تھی اور جو آسمانی علم پر مطلع کیے گئے تھے۔ اور اگر ہم یہ نہ بھی کہیں، بلکہ یہ کہیں کہ امام ظاہری اسباب، غالب گمان اور ظاہر مصلحت کے مطابق عمل کرتا ہے، تو یہی کافی ہے، اور یہ حقیقت کے مطابق ظاہر کے قائم مقام ہے، بلا کسی شک کے، خصوصاً مخالفین کے اجتہاد کے مسلک کے مطابق، کیونکہ وہ نبی ﷺ کے اجتہاد کو بھی تسلیم کرتے ہیں، اگرچہ ہمارا مسلک وہی ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا۔

انہوں نے کہا:

امام کیوں ظاہر نہیں ہوتا، خواہ اس کے ظاہر ہونے سے اس کی شہادت ہی کیوں نہ ہو؟ اس میں تو اس کی امامت کی دلیل زیادہ واضح ہو جائے گی اور اس کے وجود میں شک ختم ہو جائے گا۔

میں نے کہا:

یہ امام پر واجب نہیں ہے، جیسے کہ اللہ تعالیٰ پر بھی یہ واجب نہیں کہ وہ گناہگاروں کو فوراً عذاب دے، یا ہر وقت معجزات ظاہر کرے، اگرچہ ہم جانتے ہیں کہ اگر وہ ایسا کرے تو اس کی قدرت کی دلیل زیادہ واضح ہو جائے، اس کے حکم کی پابندی زیادہ مؤکد ہو، اس کی نافرمانی کی قباحت زیادہ روشن ہو، اور لوگ گناہ سے زیادہ رک جائیں، مگر یہ سب کچھ اس پر واجب نہیں، نہ ہی اس کی حکمت و تدبیر کے مطابق ہے، کیونکہ وہ مصلحت کو سب سے بہتر جانتا ہے۔ پس پہلا معاملہ بھی اسی کی مانند ہے۔ پھر اس میں بھی کوئی فائدہ نہیں کہ امام اس وقت ظاہر ہو جب علم احاطہ کیے ہوئے ہو کہ اس کے ظاہر ہونے سے فساد پیدا ہوگا، نہ کہ اصلاح۔ ظاہر ہونا اسی وقت حکمت و صواب ہوتا ہے جب اس کا انجام اصلاح ہو۔ اگر امام علیہ السلام جانتے کہ اس کے ظاہر ہونے سے دین میں صلاح پیدا ہوگا، چاہے وہ خود دنیا میں باقی رہے یا شہید ہو جائے، اور اس کے تمام شیعہ و انصار بھی ہلاک ہو جائیں، تو وہ ہرگز ایک لمحہ بھی تاخیر نہ کرتے اور فوراً خدا کی رضا کے لیے ظہور کرتے۔ لیکن چونکہ عصمت کا ثبوت یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اس زمانے میں اپنے ظاہر ہونے کے فساد کو جانتا ہے، اسی لیے وہ غائب ہے، جیسا کہ ہم نے اس کے عہد اور علامات کے ذکر میں بیان کیا۔

انہوں نے کہا:

بے شک، یہ جوابات اہلِ امامت کے مقررہ اصولوں کے مطابق مسلسل اور مضبوط ہیں، اور جو شخص ان اصولوں کو تسلیم کر کے ان پر اعتراض کرے، وہ کچھ حاصل نہیں کر سکتا۔

میں نے کہا:

یہ بھی عجیب بات ہے کہ ہم اور معتزلہ دونوں امامت کو واجب مانتے ہیں، ہر زمانے میں اس کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہیں، اور اس کے بغیر دین کے ناقص ہونے کو قطعاً مانتے ہیں، لیکن وہی لوگ جو کہتے ہیں کہ نبی ﷺ کے بعد کسی زمانے میں امام سے بے نیاز رہا جا سکتا ہے، ہم پر اعتراض کرتے ہیں کہ ہم غیبت کے قائل ہیں اور امام کے ظاہر نہ ہونے کے باوجود اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ حالانکہ وہ خود مانتے ہیں کہ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے بعد سے اب تک ان کا کوئی امام نہیں، اور انہیں امید بھی نہیں کہ جلد کوئی امام قائم ہو۔ پس ہر حال میں ہم غیبت کے قائل ہونے میں زیادہ معذور ہیں اور اصولِ وجوبِ امام کے اعتبار سے زیادہ درست۔

انہوں نے کہا:

ان لوگوں نے اگرچہ امام کی ضرورت مانی ہے، لیکن ان کا عذر یہ ہے کہ امام کے غائب ہونے کی وجہ سے احکام معطل ہیں، اور تم کہتے ہو کہ تمہارے امام وقتِ غیبت تک ظاہر رہے، تو پھر تمہارے لیے کیا عذر ہے کہ تم نے حدود قائم نہیں کیں اور احکام نافذ نہیں کیے؟

میں نے اس سے کہا:

بے شک یہ لوگ اگرچہ اماموں کے بعد جو ہر زمانے میں حدود و احکام کو قائم کرتے ہیں، ان کے زمانے میں حدود و احکام کے ضائع کرنے میں پناہ لیتے ہیں، تو بھی وہ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہر زمانے میں ان میں سے ایک جماعت، جو اہلِ حل و عقد میں سے ہے، ایسی ہوتی ہے جنہیں امام کے قیام کا اختیار دیا گیا ہے، جو حدود کو قائم کرے اور احکام کو نافذ کرے۔ تو ان کے لیے کیا عذر باقی رہ جاتا ہے کہ وہ امام کے قیام سے باز رہیں، جب کہ وہ خود موجود اور معروف الاشخاص ہیں؟ پس اگر ان پر واجب ہے کہ ہر زمانے میں، جب کہ وہ ظاہر و موجود ہیں، اس امام کو قائم کریں جو احکام کو نافذ کرے، اور انہوں نے اس طویل مدت تک اس فریضے کو ترک کیا، تو وہ اس کے ذریعے گناہگار اور راہِ رشد سے گمراہ ٹھہریں گے، اور اس وجہ سے ہم ان پر الزام رکھتے ہیں، لیکن وہ اس بات کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے۔ اور اگر ان کے پاس امام کے قیام کو ترک کرنے کا کوئی عذر ہے، باوجود

اس کے کہ وہ ہر وقت موجود ہیں، تو یہی عذر ہمارے ائمہ علیہم السلام کے لیے بھی ہے کہ انہوں نے حدود قائم نہیں کیں، اگرچہ وہ ہر زمانے میں موجود رہے ہیں۔ بلکہ ہمارے ائمہ علیہم السلام کا عذر احکام کو قائم نہ کرنے میں معتزلہ کے امام مقرر نہ کرنے کے عذر سے زیادہ واضح اور ظاہر ہے، کیونکہ ہمیں یقین کے ساتھ، بغیر کسی شک کے، معلوم ہے کہ رسولِ خدا ﷺ کے اہلِ بیت میں سے بہت سے افراد اپنے وطنوں سے بے وطن کر دیے گئے، ان کے خون بہائے گئے، اور جو باقی رہ گئے وہ خوف میں مبتلا رہے، محض اس گمان کی بنا پر کہ وہ تلوار کے ساتھ قیام کے قائل ہیں اور وہی وہ لوگ ہیں جنہیں احکام کے نفاذ کا حق حاصل ہے۔ حالانکہ کسی معتزلی اور نہ کسی حشوی کا خون بہایا گیا، نہ اسے وطن سے نکالا گیا، نہ ہی اس پر محض گمان کی بنا پر خوف کیا گیا اور نہ تحقیق کے طور پر یہ پایا گیا کہ وہ ائمہ کے قعود (یعنی خاموشی) کے قائل ہیں اور نہی عن المنکر و امر بالمعروف کے باب میں سرگرم ہیں۔ بلکہ یہی لوگ مجالس میں صراحت کے ساتھ کہتے ہیں کہ وہ اصحابِ اختیار ہیں، ان ہی کو اختیارِ حل و عقد حاصل ہے، اطاعت پر انکار کا حق ان کے پاس ہے، اور ان کے عقیدے کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرضِ لازم ہے، اور اس کے باوجود وہ حکمرانوں سے امن میں ہیں، ان کے اس قول سے انہیں کسی ضرر یا خوف کا سامنا نہیں۔

پس اس سے ظاہر ہو گیا کہ امام کے قیام کو ترک کرنے میں ان کے لیے کوئی عذر نہیں، اور وہ واضح عذر جس میں کوئی شبہ نہیں، ہمارے ائمہ علیہم السلام کے لیے حاصل ہے کہ انہوں نے حدود قائم نہیں کیں اور احکام نافذ نہیں کیے، جیسا کہ ہم نے ان کے حالات بیان کیے اور ان کی صفات واضح کیں، اور یہ بات روشن ہے۔

تو وہ کسی چیز کے ساتھ نہیں آیا، اور اللہ ہی کے لیے حمد ہے، اور اس کے رسول و آل پر درود و سلام ہو۔

اور اللہ ہی حق کی طرف رہنمائی کرنے والا ہے۔